دعوت الی اللہ اور اس میں حکمت کے تقاضے

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۵ رفروری ۱۹۸۳ء بمقام ناصر آباد سندھ)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۲۶ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝۱۲۷ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝۱۲۸ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝۱۲۹ (النحل: ۱۲۶-۱۲۹)

اور پھر فرمایا:

قرآن کریم کی جن آیات کی میں نے تلاوت کی ہے یہ سورۂ نحل کی آخری چار آیات ہیں اور ان میں ایک مومن کو نہ صرف تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے بلکہ تبلیغ سے متعلق طریق کار اور حکمت عملی پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس سے پہلے میں نے سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی چند آیات کو اسی مضمون کا عنوان بنایا تھا اور بتایا تھا

کہ اللہ تعالیٰ یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کے بندے احسن قول کے ساتھ اور احسن عمل کے ساتھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے ہونگے۔

اللہ ایک مشترک لفظ ہے جو تمام مذاہب میں ایک قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔ مشرک مذاہب بھی ایک نہ ایک اللہ کا تصور ضرور رکھتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے بنا کر بتوں کو پوجتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو بالآخر یہی بتاتے ہیں کہ ایک اللہ ضرور ہے اور یہ اس کے مظاہر ہیں یا چھوٹے الٰــہ ہیں۔ پس اللہ کی طرف بلانے کا تصور ایک قدر مشترک ہے جو تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے لیکن یہاں اس آیت میں اس طرز کو بدل کر اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ کہ اے محمد! (ﷺ) تو اپنے رب کی طرف بلا۔

اب تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب کیا دوسروں کے رب سے مختلف تھا؟ اس میں رب کو آنحضرت ﷺ کی طرف مضاف کیوں کیا گیا۔ اس کی بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ رب کا تصور جدا جدا ہوتا ہے اور اگر چہ مختلف مذاہب کے نام پر ہر ایک رب کی طرف بلاتا ہے لیکن اس ایک رب یا الٰہ کے نام کے نیچے اتنے مختلف وجود نظر آتے ہیں کہ اگر آپ ان کا تجزیہ کریں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مخالف سمتوں کی طرف بلا رہے ہیں اس لئے کہ ہر ایک کا رب کے متعلق اپنا ایک الگ تصور ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے محمد! (ﷺ) تو اس رب کی طرف بلا جس رب کی طرف تو خود پہنچا اور جس سے تو نے لقا حاصل کی اور جس کو تو نے اپنی قلبی رؤیت سے دیکھا اور جو پوری شان کے ساتھ تجھ پر ظاہر ہوا، اس کی طرف دنیا کو بلا کیونکہ اس سے پہلے اس خدا کی طرف کبھی کسی بلانے والے نے نہیں بلایا۔ موسیٰ ؑ نے بھی بظاہر اسی خدا کی طرف بلایا، عیسیٰ ؑ نے بھی بظاہر اسی خدا کی طرف بلایا اور دوسرے بلانے والے بھی بظاہر اسی خدا کی طرف بلاتے رہے لیکن وہ رب جو محمد مصطفیٰ ؐ پر ظاہر ہوا اور اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا اس رب کے تصور میں اور موسیٰ ؑ کے رب کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بظاہر ذات ایک ہے لیکن جلوہ گری مختلف ہے۔ چنانچہ طور سینا کا جو واقعہ گزرا ہے جس کا قرآن کریم میں بھی ذکر ملتا ہے اس میں یہی اشارہ تھا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب اس شان کا رب تھا کہ موسیٰ ؑ اس کی تجلی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ باوجود اس کے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

کو کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ خدا بار بار اس سے کلام کرتا رہا لیکن جب خدا موسیٰؑ پر ظاہر ہوا تو وہ اپنی شان میں اور اپنے جلال میں اور اپنے جمال میں اس سے مختلف تھا جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ظاہر ہوتا تھا۔

چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خبر دی گئی کہ ایک عظیم الشان نبی آنے والا ہے جسے میں ایک خاص جلوہ دکھاؤں گا تو وہ بضد ہو گئے اور اصرار کرنے لگے کہ اے خدا! مجھے بھی وہ چہرہ دکھا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وہ آیت نازل ہوئی کہ میں پہاڑ پر وہ تجلی ظاہر کرتا ہوں اگر پہاڑ اس تجلی کا متحمل ہو جائے تو پھر میں تجھے بھی دکھا دوں گا۔ یہ ایک کشفی نظارہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے یعنی وہ تجلی ابھی ان پر نازل نہیں ہوئی تھی۔ تجلی بظاہر پہاڑ پر نازل ہوئی تھی جس کا پہاڑ تو کیا متحمل ہو سکتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام جو پاس کھڑے تھے وہ بھی بے ہوش ہو گئے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ ایک کشفی نظارہ تھا۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات پہاڑوں پر نازل نہیں ہوا کرتیں خصوصاً وہ خدا جو آنحضور ﷺ پر روشن ہوا وہ تو ایک کامل باشعور ہستی پر ہی روشن ہو سکتا تھا اس لئے پہاڑ بھی ایک تمثیل ہے جیسا کہ قرآن کریم کی بعض دوسری آیات میں واضح طور پر یہ فرما دیا گیا ہے کہ پہاڑ کا یہ لفظ ہم تمثیل کے طور پر بولتے ہیں۔ فرمایا:

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝
(الحشر: ۲۲)

تم ظاہراً پہاڑ نہ سمجھ لینا۔ مراد یہ ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ اتنی عظیم الشان وحی ہے کہ گویا اگر پہاڑوں پر نازل ہوتی تو ان کا سینہ بھی پھاڑ دیتی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مضمون اس کشف میں سمجھا دیا گیا کہ تم اس لائق نہیں کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب تم پر بھی اسی طرح ظاہر ہو جائے۔

پس اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ میں محض اللہ کی طرف بلانا مراد نہیں بلکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جس شان سے خدا ظاہر ہوا تھا اس تمام شان کی طرف بنی نوع انسان کو بلانا مقصود ہے اور وہ خدا ایسا ہے جو رب العالمین ہے۔ موسیٰؑ کا خدا تو رب العالمین کے طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا وہ تو بنی اسرائیل کے خدا کے طور پر ظاہر ہوا تھا۔ ہندوستان میں خدا ظاہر ہوا، وہ ہندو دھرم کے لئے کرشن کو مظہر بنا کر ظاہر ہوا اور کنفیوشس کا خدا صرف چین کے لوگوں کو بلانے کے لئے تھا اور ایران میں زرتشت

کا خدا ظاہر ہوا لیکن صرف ایرانیوں کے لئے۔ پس اس مضمون میں رَبِّكَ کہہ کر جو نسبت دی گئی ہے اس میں بہت ہی وسیع مضمون بیان کر دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی رب محمد (ﷺ) کی صفات بیان کی گئی ہیں، اہل علم اگر غور کریں تو ان کو ہر دوسرے مذہب کے مقابلہ میں ان صفات میں ایک امتیازی فرق نظر آئے گا۔

غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کو اس خدا کی طرف بلاؤ جو آنحضرت ﷺ کا خدا ہے اسی لئے یہاں مخاطب صرف حضور اکرم ﷺ کو کیا گیا ہے اگر چہ پیغام تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ اے محمدؐ! تو اکیلا نکل جا اور تبلیغ شروع کر دے اور تیرا کوئی ساتھی تیرے ساتھ نہ چلے۔ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کیا گیا لیکن پیغام تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر رَبِّكُمْ کیوں نہیں کہا؟ اس لئے نہیں کہا کہ اس معاملہ میں جہاں تک صفات باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس میں ہر انسان کا رب مختلف ہو جاتا ہے۔ اتنا بدل جاتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کا خدا گویا الگ الگ ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے اس حکمت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِىْ بِىْ (صحیح بخاری کتاب التوحید باب قول اللہ تعالیٰ ویحذرکم اللہ نفسہ) میں تو اپنے بندوں کے ظن کے مطابق اپنی شکلیں ڈھال لیتا ہوں۔ جیسا جیسا کسی کا وسیع حوصلہ ہوگا ویسا ہی وسیع خدا اس پر جلوہ گر ہوگا۔ جیسا جیسا تنگ نظر انسان ہوگا ویسا ہی گویا تنگ صفات والا خدا اس پر ظاہر ہوتا اسے محسوس ہوگا۔

اس مضمون میں ایک اور بہت بڑے فلسفیانہ مسئلہ کو حل کر دیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ تو لامتناہی ہے لیکن مخلوق لامتناہی نہیں اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا تعالیٰ کا اپنی ہر مخلوق سے تعلق کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا حل یہ پیش کر دیا کہ میں تو تمہارے ظروف کے مطابق ظاہر ہوتا ہوں ورنہ تو کوئی ظرف ایسا ہے ہی نہیں جو خدا کے تمام جلووں کو اپنی ذات میں سمیٹ سکے۔ پس یہ خدا کی رحمت کا ایک نشان ہے جس کی حضور اکرم ﷺ نے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِىْ بِىْ میں خبر دی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو اپنے بندہ کی طاقت کے مطابق اس پر ظاہر ہوتا ہوں۔ اگر اپنی طاقت کے مطابق ظاہر ہوں تو تمام کائنات میں ایک بھی وجود ایسا نہیں جو میری ذات کو اپنے دل کے تصور کے طور پر بھی جگہ دے سکے۔

پس اُدْعُ اِلٰى سَبِيلِ رَبِّكَ میں آنحضرت ﷺ کا خدا ہے جو پیش نظر ہے۔فرمایا تمام دنیا کو خدا کے اس وسیع تر تصور کی طرف بلاؤ جو محمد مصطفی ﷺ کے اوپر ظاہر ہوا۔ پھر حسب توفیق وحسب مراتب کوئی اس خدا کے بعض جلووں کا مستحق اور حقدار بن جائے گا، کوئی بعض دوسرے جلووں کا مستحق اور حقدار بن جائے گا۔مگر محمد مصطفی ﷺ کا خدا جس جس پر جتنا جتنا بھی ظاہر ہوگا وہ اس کے لئے رحمتوں کے ابدی اور لامتناہی سلسلے کھولتا چلا جائے گا کیونکہ محمد مصطفی ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور آپ کا خدا رب العالمین ۔گویا صرف یہی دو کھڑکیاں ہیں جن کے رستے ہم محمد مصطفی ﷺ کے رب کا تصور باندھ سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے یہ مضمون تو ایک نہ ختم ہونے والا مضمون ہے۔قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ پر ظاہر ہونے والے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے اس کا تمام کائنات کے مذاہب کے مشترکہ تصور سے بھی موازنہ کر کے دیکھیں تو دل اس اطمینان سے بھر جائے گا کہ یہ خدا ان سب کے خداؤں کی مجموعی شان سے بھی کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ذات وہی ہے اس بات میں تو کوئی ابہام نہیں رہنا چاہئے لیکن وہ ذات ظاہر کس طرح ہوئی، یہ ہے فرق ۔اسی طرح آنحضور ﷺ پر اس ذات کی جلوہ گری باقی تمام انبیاء پر ظاہر ہونیوالے خدا کی جلوہ گری سے کمیت کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے لحاظ سے بھی ارفع اور اعلیٰ ہے۔

پس اتنے عظیم الشان پیغام کے آپ لوگ امین بنائے گئے ہیں جب تک اس رب سے تعلق پیدا نہیں ہوگا اس کا حق کس طرح ادا کریں گے اور اس کے امین کس طرح بنیں گے اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی دے دیا گیا کہ چونکہ تمہارا رب ، رب العالمین ہے اس لئے دنیا کے تمام مذاہب اور تمام لوگوں کو تم نے مخاطب کرنا ہے۔کوئی ایک خیال، کوئی ایک نظریہ، کوئی ایک خطۂ ارض، کوئی کالا، کوئی گورا اس پیغام سے باہر نہ رہے اور اسے اس طرح عام کر دینا ہے کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہ رہے جو حضور اکرم ﷺ پر ظاہر ہونے والے خدا کی رحمت سے محروم رہ جائے۔

پھر اُدْعُ اِلٰى سَبِيلِ رَبِّكَ میں آزادی مذہب کا بھی اعلان کر دیا گیا اور وہ اس طرح کہ اگر آنحضرت ﷺ کو اپنے رب کی طرف بلانے کا حق ہے تو لازماً تمام دنیا میں ہر شخص کو اپنے اپنے تصور کے مطابق رب کی طرف بلانے کا حق ہے۔(اس موقع پر اچانک لاؤڈ اسپیکر بند ہو گیا جسے ٹھیک کرنے

میں چند منٹ لگے۔اس توقف کے بعد حضور نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا)

میں یہ بتا رہا تھا کہ اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ میں آنحضرت ﷺ کو جو یہ حق دیا کہ آپؐ اپنے رب کی طرف لوگوں کو بلائیں تو اس میں گویا آزادئ مذہب اور آزادئ ضمیر کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ کیونکہ اگر ایک شخص کو یہ حق ہے کہ اس رب کی طرف دنیا کو بلائے جس رب کو وہ حقیقتاً رب سمجھتا ہو تو تمام دنیا میں ہر انسان کو یہ حق مل جاتا ہے ورنہ ایک کو بھی نہیں ملتا اس لئے اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ میں ایک عظیم الشان اعلان ہے اور اس کے ذریعہ تمام دنیا کے ہر انسان کو اپنے رب کی طرف بلانے کی ایک ایسی آزادی دی گئی ہے جسے دنیا میں کوئی چھین نہیں سکتا۔ اگر ایک کی آزادی پر تبر رکھو گے تو تمام دنیا میں ہر انسان کی آزادی پر تبر پڑ جائے گا۔

اس مضمون کو ظاہر کرنے کے بعد اب آگے جا کر یہ آیت ایک اجتماعی شکل میں مسلمانوں سے خطاب کرنے لگے گی اور پھر آنحضرت ﷺ کی طرف لوٹ آئے گی۔ یہ ایک بہت ہی پیارا فصیح و بلیغ کلام ہے جس کی کوئی مثال آپ کو دنیا میں نظر نہیں آسکتی۔

جب یہ فرمایا اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ تو اس ضمن میں پہلی بات جو تبلیغ کی حکمت عملی کے طور پر بیان فرمائی گئی وہ ہے بِالۡحِکۡمَۃِ اور پھر فرمایا وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ۔ موعظہ حسنہ یعنی اچھی بات جس کی طرف بلانا مقصود ہے، اس کو بعد میں رکھا اور بِالۡحِکۡمَۃِ کو پہلے رکھ دیا۔ پھر آخر پر فرمایا وَجَادِلۡہُمۡ۔ اب ان سے تم مقابلہ کرو، مجادلہ کرو، لیکن بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ایسے رنگ میں مجادلہ کرو جو نہایت ہی حسین ہو بلکہ تمام حسنوں سے بڑھ کر حسین ہو۔

بِالۡحِکۡمَۃِ میں حکمتوں کا ایک بہت ہی وسیع مضمون ہے۔ ایک چھوٹے سے لفظ کے اندر مسلمان کو تبلیغ کے ایک بنیادی اصول کی طرف توجہ دلا دی ہے۔ ہر شخص کی حکمت الگ ہوتی ہے، ہر ماحول کی حکمت الگ ہوتی ہے، ہر وقت کی حکمت الگ ہوتی ہے، ہر قوم کی حکمت الگ ہوتی ہے۔ اس لئے اس لفظ کو آزاد چھوڑ دیا گیا تا کہ حسب حال جو بھی حکمت کا بہترین طریق ہے وہ تم اختیار کرسکو۔ اس میں مومن کے لئے غور اور تدبر اور فکر کی ایک عظیم الشان دعوت ہے۔ کوئی مومن جو اس آیت کے تابع مبلغ بننا چاہے جب تک وہ اپنے دماغ کو بڑی گہرائی اور بصیرت کے ساتھ استعمال نہیں کرتا وہ مومن بننے کا اور مبلغ بننے کا حق نہیں رکھتا۔ حکمت میں جو مختلف امکانی پہلو ہیں وہ تو جیسا

کہ میں نے بیان کیا ہے ایک لامتناہی مضمون پر مشتمل ہیں۔لیکن میں اس وقت چند ایک کی وضاحت کر دیتا ہوں تا کہ جب آپ کو میں مبلغ بنانا چاہتا ہوں تو آپ کو تبلیغ کے ان تقاضوں کا بھی علم ہو جو قرآن آپ سے کرتا ہے۔اس کے بغیر تو بغیر ہتھیار لڑنے والی بات ہوگی۔

حکمت سے بلانا جبر سے بلانے کے بالکل برعکس ہے۔حکمت سے بلانے کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی بچہ دیوار کے کنارہ پر پہنچا ہوا اور گرنے والا ہو، اگر آپ اس کو بلند آواز سے بھی بلائیں گے تو خطرہ ہے کہ دوسری طرف جا پڑے۔بعض دفعہ زمینداروں کے گھوڑے چھٹ جاتے ہیں۔اگر ان کی طرف کوئی بے وقوفی سے دوڑ پڑے تو وہ اور بھی دور نکل جاتے ہیں اور کبھی قابو نہیں آتے۔ان کو پچکار کر کبھی ہاتھ میں کوئی چیز دکھا کر، کبھی چارہ کاٹ کر لے لیا اور وہ دکھا کر بڑے پیار سے بلانا پڑتا ہے۔ چنانچہ جس طرح جانور بدکتے ہیں اسی طرح انسان بھی انسانوں سے بدکتے ہیں۔تاریخ مذاہب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ بدکنے کا منظر اس وقت دکھائی دیتا ہے جب خدا کی طرف سے کوئی بندہ ظاہر ہوتا ہے۔جب خدا کی طرف سے کوئی بلانے والا آتا ہے تو اس وقت قوم سب سے زیادہ بدکا کرتی ہے۔چنانچہ قرآن کریم اس منظر کو یوں پیش کرتا ہے کہ اے محمد مصطفیٰ ﷺ! یہ لوگ تجھ سے اس طرح بھاگ رہے ہیں، تیرے پیغام سے اس طرح بدک رہے ہیں جیسے شیر سے دوسرے جانور۔ مثلاً بھیڑ، بکریاں اور گائیں وغیرہ بدک جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (المدثر:۵۲) کہہ کر اس کا نقشہ کھینچا ہے۔جس طرح شیر کی دہشت ہوتی ہے کہ وہ کھا جائے گا اور کمزور جانور اس سے ڈر کر بے اختیار بدکتے ہیں۔اسی طرح گویا لوگ تیرے پیغام سے بدک رہے ہیں۔

چنانچہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ ہم کس کی طرف بلانے والے ہیں۔تاریخ عالم ہمیں کیا بتا رہی ہے کہ ایسے پیغامات کا نتیجہ کیا نکلا کرتا ہے۔قرآن کی تاریخ بڑی واضح ہے۔سب سے پیارا قول تو یہی ہے کہ خدا کی طرف بلاؤ۔خدا کی طرف بلانے کے نتیجہ میں لوگ سب سے زیادہ متنفر ہوا کرتے ہیں۔تو اس حکمت کا طبعی تقاضا یہ نکلا کہ اتنی ہی زیادہ نرمی ہونی چاہئے۔چنانچہ قرآن کریم نے اس مضمون کو اس طرح ظاہر کیا کہ آنحضرت ﷺ کو رحمۃ للعالمین قرار دے دیا۔فرمایا کہ چونکہ اس پر بوجھ بہت بڑا ہے اور دنیا اس سے بدکنے والی ہے اس لئے اس کا جواب یہ ہے کہ ساری دنیا سے اتنا پیار کرنے والا ہو کہ اس کا پیار غالب آجائے اور مقابلہ میں مخالفین کی نفرتیں

ٹوٹ جائیں۔ گویا جتنا بڑا بوجھ تھا اتنا ہی بڑا علاج بھی عطا فرما دیا۔ اتنی ہی بڑی مقابل پر طاقت بھی عطا فرما دی۔

پس حکمت کے تقاضے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ سب سے پہلے ہمیں تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے اور تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اس دشمنی کا علاج اپنی بڑھی ہوئی محبت اور حد سے زیادہ تلطف سے ہم دیں گے تب ہماری بات مانی جائے گی ورنہ نہیں مانی جائے گی۔

حکمت کا دوسرا تقاضا جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ ہے موقع اور محل کے مطابق بات کرنا۔ ہر بات اپنے موقع پر اچھی لگتی ہے۔ ایک آدمی کو اپنے کام میں جلدی ہے یا خیالات میں افراتفری ہے اور آپ اس کو پیغام دینا شروع کر دیں تو یہ بات موقع اور محل کے مطابق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی اتنا کمزور ہے کہ وہ سوسائٹی سے ڈرتا ہے۔ اگر آپ مجلس میں جا کر اس طرح اس سے گلے ملیں گویا وہ آدھا احمدی ہو چکا ہے یا آدھے سے زیادہ احمدی ہو چکا ہے تو اس طرح آپ اس کو بدکا دیں گے۔ وہ خوف محسوس کریگا کہ اوہو میں تو پکڑا گیا ایسے تعلق میں کہ اب دنیا مجھے ذلیل کر دے گی۔ یہ بھی حکمت کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو آپ غور سے پھیلا کر دیکھیں تو بہت سے دوست تبلیغ کے معاملہ میں ایسی غیر حکیمانہ باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف سے وہ دوست بنا رہے ہوتے ہیں تو دوسرے رستے سے دوستوں کو باہر نکال رہے ہوتے ہیں۔

پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جب نفرت ہو تو اچھی چیز بھی پیش کی جائے تو انسان اس کو پسند نہیں کرتا۔ جب تک پیش کرنے کا طریقہ اتنا اچھا نہ ہو کہ وہ اس نفرت پر غالب آ جائے اس وقت تک تبلیغ کارگر نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر ایک شخص دشمنی کی حد تک مخالفت کرتا ہے۔ آپ اگر اس کو کھانا پیش کریں تو بسا اوقات وہ بھوکا بھی ہوگا تو کہے گا مجھے اس میں دلچسپی نہیں، جاؤ تم کھاؤ۔ لیکن اگر اس کو اس طریق پر کھانا پیش کیا جائے کہ گویا آپ بچھ گئے ہیں، آپ کی جان اس پر فدا ہو رہی ہے تو وہ دشمن بھی ہوگا تو بعض دفعہ اس کے دل میں انسانیت جوش مارے گی اور وہ کہے گا کہ یہ میرے سامنے اتنا گر رہا ہے تو میں ایک لقمہ کھا لوں۔ اس کے برعکس بعض ایسے بیوقوف بھی ہوتے ہیں جو دوست سے زیادہ بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ دوست کو اپنے گھر بلایا ہوا ہے اور اس سے ایسی بے تکلفی سے پیش آتے ہیں کہ جو بدتمیزی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کہتے ہیں اچھا، کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ بھاگ جاؤ۔ وہ

اپنی طرف سے پیار سے کہتے ہیں لیکن یہ طرز عمل حکمت کے خلاف ہے۔ جو آدمی گھر میں آیا ہوا ہوتا ہے اس کے جذبات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض دفعہ ایسے دوست پھر کہہ دیتے ہیں جاؤ جہنم میں تم کھاؤ میں کھاتا ہی نہیں۔ اسی بات پر بعض دفعہ لڑائیاں بھی ہو جاتی ہیں۔

پس آپ کا جو کام ہے وہ انتہائی نازک ہے۔ جہاں ایک طرف آپ کو اسوۂ نبوی میں دوسروں کے لئے بے انتہا رحمت بننا پڑے گا وہاں طرز کلام بھی نہایت حکیمانہ اختیار کرنی پڑے گی اور یہ سوچ کر بات کرنی ہوگی کہ عام باتوں سے وہ دوست بہرحال بدکیں گے۔ ان کے لئے زیادہ ملائمت کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت ہے، زیادہ پیار کی ضرورت ہے اور پھر ان کے حالات کو مدنظر رکھ کر ان کے تقاضے بھی پورے کرنے پڑیں گے۔ بہت سے واقعات میرے علم میں ہیں جہاں احمدی دوستوں نے بعض لوگوں کو خود بدکا دیا اور کچی حالت میں پھل توڑنے کی کوشش کی یہ بھی حکمت کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں کے اندر نمبر بنانے کی بڑی تمنا ہوتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے جلدی ہمارے نمبر بنیں۔ چنانچہ بعض لوگ تعارف کرواتے وقت ابھی دو تین باتیں ہی ان سے کی ہوئی ہوتی ہیں تو وہ ان سے کہہ اٹھتے ہیں کہ جی یہ صاحب میرے زیر تبلیغ ہیں اور میں ان کو خوب تبلیغ کر رہا ہوں اور یہ قریب آ رہے ہیں، آپ دعا کریں اور مجھے اس کا بگڑتا ہوا چہرہ نظر آ رہا ہوتا ہے کہ یہ کیا بے ہودہ باتیں کر رہا ہے۔ تو یہ بھی حکمت کے خلاف ہے۔

حکمتوں کے تقاضوں میں سے ایک اور تقاضا یہ ہے کہ انسانی مزاج کو سمجھ کر بات کی جائے اور اس طریق کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر عمارت کا ایک نقشہ ہوتا ہے اور اس نقشے کے مطابق اس عمارت میں داخل ہونا پڑتا ہے اور اس کے کمروں کے بھی اپنے اپنے نقشے ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق رستے تلاش کر کے ان میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ آپ یہ تو نہیں کرتے کہ چونکہ یہ عمارت ہے اس میں رہنا ہے دیواروں سے ٹکریں مارتے پھریں۔ اور ہر عمارت ایک الگ طریق پر بنی ہوئی ہوتی ہے کسی کا نقشہ شمال جنوب کے حساب سے ہے، کسی کا مشرق مغرب کے لحاظ سے ہے، کوئی اور طرح بنا ہوا ہے ایسی طرز پر ہے کہ بعینہٖ جنوب کی طرف اس کا رخ نہیں اور پھر دروازوں کی شکلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان کی Setting الگ الگ ہوتی ہے۔ روشنی میں جب آپ دیکھ کر اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کو اس کا نقشہ نظر آ رہا ہوتا ہے اس لئے آپ

بے دھڑک دروازوں میں سے اندر داخل ہوتے ہیں۔ لیکن نیا آدمی ہو اس کے لئے اس کی مثال بالکل ایسے گھر کی سی ہے جو اندھیرے میں ہے، اس کے راستوں کا اس کو پتہ نہیں۔ پس اگر آپ بغیر حکمت کے یہ خیال کریں گے کہ ہر طرف سے کسی آدمی کی اسلام میں دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے تو یہ بڑی بے وقوفی ہے۔ ہر ایک کا اپنا الگ الگ رستہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے واقفیت پیدا کرنی پڑے گی۔ پہلے اپنے لئے روشنی کا انتظام کرنا ہوگا۔ ایسی روشنی جس میں آپ اس کو پوری طرح دیکھ سکیں، اس کے مزاج کو پوری طرح پڑھ سکیں اور یہ جان سکیں کہ اس کے رجحانات کیا ہیں، کن باتوں سے یہ بدکتا ہے پھر اس کے مطابق اس سے معاملہ کریں۔

پھر حکمت کا ایک اور تقاضا یہ ہے کہ اپنے مزاج اور اپنے رجحان کا بھی جائزہ لیں، ہر انسان ہر قسم کی تبلیغ نہیں کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنے اپنے رنگ میں استعدادیں عطا فرمائی ہیں۔ ہر انسان کی دوسرے سے استعدادیں مختلف ہیں۔ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جن کو خدا نے ایسی شخصیت دے رکھی ہوتی ہے کہ وہ تمام دنیا میں درویشانہ پھریں دنیا ان کو بطور درویش قبول کر لیتی ہے اور وہ بطور درویش ایک کامیاب زندگی گزارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قادیان میں ایک ایسے ہی صاحب تھے جن کا مزاج خدا نے ایسا بنایا تھا۔ ان کے اندر شخصیت کی جاذبیت بھی بخشی تھی۔ انہوں نے چولہ پہن لیا تھا اور اس پر مختلف عبارتیں اور دعوت کے کلمات لکھ کر وہ تمام دنیا میں فقیرانہ پھرتے رہے اور جب تک زندہ رہے وہ اسی طرح تبلیغ کرتے رہے۔ لیکن ہر شخص یہ کام تو نہیں کرسکتا کیونکہ ہر ایک کی استعداد الگ ہے، اس کا مزاج الگ ہے، اس کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں اس لئے ہر ایک کو اپنی استعداد کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ہمارے بعض سائیکل سوار ہیں۔ مثلاً قریشی محمد حنیف صاحب ہیں، انکی استعداد یہی ہے، وہ اس کے مطابق تبلیغ کر رہے ہیں لیکن یہ کہنا کہ کسی شخص میں تبلیغ کی استطاعت نہیں ہے، یہ غلط ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر الزام ہے اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہر شخص کی استعداد چونکہ مختلف ہے اس لئے مقابل کے انسان سے معاملہ بھی الگ الگ کرنا پڑے گا۔ اب دیکھ لیجئے ان دونوں کی Combination یعنی ملاپ سے مختلف مسائل سامنے آتے ہیں۔ یعنی آپ کے مدمقابل بھی بے انتہا مزاجوں والے ہیں۔ ان کے اندر داخلوں کے رستے الگ الگ ہیں انہیں سمجھانے کے طریق بالکل الگ الگ ہیں ہر شخص کی ایک انفرادیت ہے اس کے مطابق اس سے بات

کرنی ہوگی اور آپ کے بھی مزاج الگ الگ ہیں، خدا نے آپ کی استعدادیں الگ الگ بنائی ہیں ان کو مدنظر رکھ کر اپنے لئے ایک صحیح رستہ تجویز کرنا ہوگا کہ میں کیا ہوں اور میں کس طرح اس فریضہ کو بہترین رنگ میں ادا کرسکتا ہوں۔ بعض لوگوں کو بولنا نہیں آتا، بعض لوگوں کو لکھنا نہیں آتا، بعض لوگ پبلک میں لوگوں کے سامنے شرماتے ہیں لیکن علیحدہ چھوٹی مجلس میں بہت اچھا کلام کر لیتے ہیں، بعض لوگ عوامی مجلسوں میں بڑا کھلا خطاب کر لیتے ہیں تو خدا نے جو مزاج بنایا ہے اگر کوئی اس مزاج سے ہٹ کر بات کرے گا تو اس سے جگ ہنسائی ہوگی۔

مجھے یاد ہے ماڈل ٹاؤن لاہور میں پارٹیشن کے معاً بعد کی بات ہے وہاں ہمارا ایک بچہ تھا۔ وہ جب بھی لوگوں کو تقریر کرتے دیکھتا تو اس کو بھی بڑا جوش آتا تھا کہ میں بھی تقریر کروں اور حالت یہ تھی کہ نہ اس کو اس وقت تقریر کرنی آتی تھی نہ آج تک آسکی۔ اس بیچارے کا مزاج ہی ایسا نہیں کہ تقریر کر سکے لیکن ایک دفعہ اطفال الاحمدیہ کا جلسہ ہو رہا تھا تو اس نے بڑے زور وشور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آخر ان کے زعیم صاحب نے یہ کہہ کر ان کو موقع دیا کہ اچھا اب آپ تشریف لائیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ چنانچہ جب وہ تقریر کرنے کے لئے وہاں کھڑا ہوا تو پہلے تو کانپنے لگا اور پھر زاروقطار رونے لگ گیا۔ بیچارہ اتنا نروس ہوگیا کہ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ اس کو بڑی تسلیاں دیں، پیار کیا، شاید کچھ انعام بھی دیا اور آرام سے بٹھا دیا۔ اگر چہ تقریر کرنے کی اس میں استعداد نہیں ہے لیکن (Table Talk) ٹیبل ٹاک وہ بہت اچھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے خدا کے فضل سے بہت اچھا مبلغ ہے۔ دو یا تین آدمیوں کے ساتھ مل کر کھانے کی میز پر یا چائے پر وہ ایسی پیار سے اور ایسی حکمت سے باتیں کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جہاں بھی وہ تبلیغ کرتا ہے اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ پس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف دوسرے کی استعداد نہ دیکھو، اپنی استعداد بھی دیکھو۔

پھر وقت الگ الگ ہوتے ہیں اور زمانے الگ الگ ہوتے ہیں۔ وقت کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں، زمانوں کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک زمیندار خوب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جب وہ فصل کاشت کرتا ہے تو اس کا ایک خاص وقت ہوتا ہے اور جب وہ برداشت کرتا ہے تو اس کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ انسان بے اختیار ہے وہ اگر چاہے بھی تو وقت اور زمانے کے تقاضوں کو بدل

نہیں سکتا۔ البتہ بعض دفعہ نفسیاتی لحاظ سے ایسے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں جن میں ہدایت کو قبول کرنے کا ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ان اوقات سے بھی استفادہ کیا جائے اس لئے مختلف وقتوں میں مختلف قسم کی باتیں زیب دیتی ہیں اور وہ اثر کرتی ہیں۔ مثلاً جب غم کی کیفیت ہو تو اس وقت اور قسم کی بات کی جاتی ہے اور جب خوشی کی کیفیت ہو تو اور طرح کی بات کی جاتی ہے اسی طرح جب خوف و ہراس کا زمانہ ہو تو اور طریقے سے بات کرنی پڑے گی۔

اس سلسلہ میں مجھے بہت سے دوست واقعات بتاتے رہتے ہیں۔ خود میرے علم میں ایسے بیسیوں واقعات ہیں کہ ایک احمدی نے جب بھی حکمت سے کام لیا اور موقع و محل کے مطابق بات کی تو بہت جلدی اس کا پھل لگا۔ چنانچہ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا ہمارے ایک معلم وقف جدید تھے جو ان پڑھ تھے۔ سو فیصدی تو نہیں لیکن ان پڑھ کے قریب ترین جو آدمی ہوتا ہے وہ ان کی کیفیت تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی تبلیغ کو سب سے زیادہ پھل لگتا تھا کیونکہ جو علم کی کمی تھی وہ اس کو دعا اور حکمت کے ذریعہ پوری کرتے تھے۔ چنانچہ موقع اور محل کی تلاش میں رہنا اور حسب حالات گفتگو کرنا ان کا شیوہ تھا۔ کہیں شادی کی مجلس ہے تو شادی کی باتیں اور پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ کلام شروع کر دیا جو خوشی کے موقع کا کلام ہے۔ اگر غم کی کیفیت ہے تو اس میں صبر کی تلقین کرتے کرتے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی واقعہ سنا دیتے کہ آپ کو جب دکھ پہنچتے تھے تو آپ یوں کیا کرتے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت ہی حکمت عطا کر رکھی تھی۔ ایک مولوی صاحب تھے جو ان کے بہت شدید مخالف تھے ایسے مخالف کہ کئی دفعہ ان کو مار پڑوا کر اپنے گاؤں سے باہر نکلوا چکے تھے۔ مگر یہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے دُھن کے ایسے پکے اور ایسے بے خوف انسان تھے کہ کبھی پرواہ نہیں کی۔ بار بار ماریں بھی کھائیں مگر پھر بھی ان کے پاس پہنچ جاتے تھے یہاں تک کہ مولوی صاحب تھک گئے اور انہوں نے مارنا پیٹنا چھوڑ دیا۔ پھر تھوڑی بہت باتیں شروع ہوئیں لیکن مولوی صاحب اپنی ضد پر قائم اور یہ اپنے فرض تبلیغ پر قائم رہے۔ ایک دفعہ کسی کی تدفین کے لئے مولوی صاحب جا رہے تھے تو یہ بھی ساتھ چل پڑے۔ جب وہ میت کو لحد میں اتارنے لگے تو اس وقت ان کو خیال آیا کہ مولوی صاحب نہ دلیل سے قابو آتے ہیں اور نہ تبشیر سے قابو آتے ہیں ہوسکتا ہے ڈرپوک ہوں خوف سے قابو آجائیں۔ چنانچہ جب وہ میت کو لحد میں اتارنے لگے تو انہوں نے بڑی جرأت کے

ساتھ آگے بڑھ کر مولوی صاحب کو گریبان سے پکڑ لیا اور کہا مولوی صاحب! ایک منٹ ٹھہر جائیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ جہاں آپ اس مردے کو داخل کر رہے ہیں یہ وہاں سے کبھی واپس آ جائے گا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے دیکھا اور کہا کہ کبھی مڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ یہ بولے کہ گویا اس کے اعمال کا دور ختم ہو گیا، اب پھر اس کو اعمال کا موقع نہیں ملے گا، جو خدا نے اس سے پوچھنا ہے وہ اس سے پوچھے گا اور یہ بے بس ہو گا واپس نہیں جا سکتا، اپنے اعمال میں کچھ بھی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ مولوی صاحب نے کہا ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا پھر آپ کے ساتھ بھی یہی ہونا ہے اور یہ کہہ کر الگ ہو گئے۔ رات مسجد میں سوئے ہوئے تھے تو جس طرح حضرت مولوی راجیکی صاحب کا واقعہ آتا ہے ویسا ہی ملتا جلتا واقعہ ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہی مولوی صاحب آدھی رات کے وقت روتے پیٹتے پہنچ گئے کہ میری بیعت کرواؤ۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی بیعت کرواتے ہیں لیکن یہ تو بتائیں ہوا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حساب کتاب ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھ سے سوال ہی یہ کیا کہ امام مہدی کا زمانہ پایا تھا تو تم نے کیا کیا اور میں چیختا چلاتا ہوں اور میں کہتا ہوں مجھے واپس جانے دو، میں سمجھ گیا ہوں لیکن کہا گیا اب کوئی وقت نہیں رہا۔ چونکہ ہمارے معلم نے موقع اور محل کے مطابق بات کی تھی اور قرآن کریم نے وعدہ کیا ہے کہ اگر حکمت کے ساتھ بات کرو گے تو اس کا پھل بھی پاؤ گے۔ چنانچہ وہ مولوی صاحب خدا کے فضل سے صرف احمدی ہی نہیں ہوئے بلکہ اتنے مخلص اور خوددار احمدی بنے کہ میں نے از خود یہ سوچ کر کہ وہ مولوی تھے ان کے گزارہ کی کوئی صورت نہیں رہی ہوگی پیشکش کی کہ آپ کو وقتی طور پر جب تک آپ کو ضرورت ہے آپ کے لئے کچھ گزارہ مقرر کر دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا بالکل نہیں میں اپنا ایمان خراب نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ انہوں نے اسی گاؤں میں چھابڑی لگائی اور جو کچھ بھی روکھی سوکھی میسر آئی اس سے گزر اوقات کیا اور ایک مبلغ بن گئے۔

پس حکمت سے بات کرنے کے لامتناہی تقاضے ہیں۔ اگر آپ ان کو نظر انداز نہ کریں اور بیدار مغزی کے ساتھ ہر موقع سے فائدہ اٹھائیں تو ہر جگہ ایک الگ الگ جواب دینے کی توفیق ملے گی۔ کوئی ایسا قانون نہیں ہے جو اکٹھا بتا دیا جائے اور وہ ہر صورت حال پر اطلاق پا جائے۔ قرآن کریم نے جہاں اختصار اختیار فرمایا ہے وہ بھی کمال شان کا اختصار ہے۔ ساری حکمتوں کا خزانہ ایک لفظ حکمت میں رکھ دیا۔ فرمایا موقع اور محل کے مطابق تم الگ الگ اس کے ترجمے کیا کرنا، الگ الگ معنے

حکمت کے نکالا کرنا۔ اگر تمہارا جواب درست ہوگا تو ہم اس بات کے ذمہ دار ہیں بلکہ ضمانت دیتے ہیں کہ تمہاری کوششوں کو میٹھے پھل لگیں گے۔

پھر حکمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مناسب زمین کا انتخاب کیا جائے۔ دنیا میں بے شمار مخلوق ہے جس کو خدا کی طرف بلانا ہے۔ انسان نظری فیصلے سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کن لوگوں پر نسبتاً کم محنت کرنی پڑے گی، کن لوگوں پر نسبتاً زیادہ محنت کرنی پڑے گی اگر وہ یہ فیصلہ نہ کرے اور نسبتاً سخت زمینوں میں محنت کرنی شروع کر دے تو اس کی محنت کو لازماً بہت کم پھل لگے گا۔ اب یہاں سندھ میں بعض زمینیں ہیں جو بڑی سخت کلر والی ہیں، بعض زمینیں ہیں جو بڑی زرخیز ہیں اگر تو زمیندار بے چارہ مجبور ہے اس کی زمین ہی تھوڑی ہے تو اس نے لازماً کلر کو ٹھیک کرنا ہی کرنا ہے۔ وہ محنت کرے گا، زور لگائے گا لیکن اگر وسیع زمیندارہ ہو یعنی اتنی زمین ہو کہ اس کی سنبھال سے باہر ہو تو اس وقت کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو کلر سے کام شروع کرے گا۔ اس وقت تو انسان اچھی زمینیں چنے گا اور اپنے اختیار اور توفیق کے مطابق اس سے بہترین پھل حاصل کرے گا۔ لیکن میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض اوقات بعض احمدی بعض ایسے لوگوں کے ساتھ سر مارتے رہتے ہیں جن کے متعلق ان کی فطرت گواہی دیتی ہے کہ یہ ضدی اور متعصب ہیں اور ان کے اندر تقویٰ نہیں ہے اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تو ہدایت کا وعدہ ان لوگوں سے کیا ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں، جن کے اندر سچائی کو سچائی کہنے کی ہمت اور حوصلہ ہے۔ پس ایک دفعہ، دو دفعہ، چار دفعہ جب آپ کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو آپ کا ذہن خود ہی آپ کو بتا دیتا ہے کہ یہ نارمل آدمی نہیں ہے۔ نارمل دلیل کا جو اثر اس پر ظاہر ہونا چاہیے وہ ظاہر نہیں ہو رہا ہوتا۔ جس طرح زمیندار جب ہل لے کر کھیت میں چلتا ہے تو اگر اینٹوں روڑوں والا کھیت ہو تو اینٹ روڑے اس کو بتا دیتے ہیں کہ یہ عام زمین نہیں، یہ مختلف زمین ہے۔ پھر جب وہ کسی جگہ بیج پھینکتا ہے اور وہاں کلر کی وجہ سے چیز پوری طرح اگتی نہیں تو خواہ بظاہر کلر نہ بھی نظر آ رہا ہو تب بھی وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ زمین ٹھیک نہیں ہے۔

بالکل اسی طرح تبلیغ میں بھی حکمت کے تقاضے یہ ہیں کہ اگر آپ کے پاس زمین زیادہ ہے تو اچھی زمین کا انتخاب کریں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں ایسی زمین پر جس نے خود اپنے ردعمل سے ظاہر کر دیا ہے کہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ جلدی اصلاح پذیر ہو جاؤں اس لیے جو زیادہ لائق ہے اس

کا انتخاب کریں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک بہت ہی عجیب بات کہی تھی جسے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑی بد خُلقی کا کلام تھا۔ الزامی جواب کے طور پر ہم اسے استعمال کرتے ہیں اور کریں گے لیکن اگر آپ اس بات کی حکمت پر غور کریں تو ہے وہی حکیمانہ بات جو ہر نبی کو سجتی ہے۔ ایک موقع پر آپؑ نے فرمایا کہ میں سؤروں کے سامنے کس طرح موتی ڈال دوں۔ (متی باب ۷ آیت ۶) مراد یہ تھی کہ تم لوگ جو سامنے آئے ہو تمہاری فطرت گندی ہے۔ میں جانتا ہوں، خدا تعالیٰ نے مجھے یہ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ میں انسان کو پہچانتا ہوں۔ میرے پاس حق و حکمت کے جو موتی ہیں یہ تو حق داروں کو میں دوں گا جو جلدی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سؤروں کے سامنے موتی ڈالنا تو میرا کام نہیں ہے۔ جس طرح ہم اردو میں کہتے ہیں کہ بھینس کے سامنے بین بجانے والی بات ہے اس لئے اگر آپ بھینس کے سامنے بین بجائیں گے اور ناقدروں کے سامنے موتی ڈالیں گے تو ویسا ہی پھل پائیں گے۔

پس حکمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ خوب پہچانیں، سعید فطرت لوگوں کو چنیں اور ان میں سے بھی پہلے جرأت مندوں کو چنیں جو مردانہ صفات رکھتے ہوں۔ وہ ایسے ہوں کہ آپ کے مددگار بنیں، آپ کے معین بنیں، وہ خود مبلغ بن جائیں۔ بعض دفعہ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو اس مبلغ سے بڑھ کر مبلغ بن جاتے ہیں جس نے ان کو تبلیغ کی ہوتی ہے۔ پھر فصل کی نگہداشت کرنا بھی تو حکمت کا تقاضا ہے۔ آپ اپنی کھیتی میں ہل چلاتے اور محنت کر کے اس میں بیج بوتے ہیں اور پھر پانی بھی دیتے ہیں پھر اس کھیتی کو چھوڑ کر تو نہیں چلے جایا کرتے کہ اب اگلے سال جب پھل کا وقت آئے گا تو برداشت کر لیں گے۔ بیچ میں کئی چور بھی آئیں گے، ان میں کئی بیماریاں بھی پڑیں گی، خشک سالی بھی آئے گی، وہ فصل تقاضے بھی کرے گی کہ اس کی نلائی (گوڈی) کی جائے غرض سو طرح کی محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ جس طرح ایک بچہ پالا جاتا ہے اسی طرح فصلیں پالی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی اسی ایک لفظ حکمت میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ تم جب تبلیغ کرتے ہو یا کرو گے تو بہت لطف اٹھاؤ گے کہ آج بڑا مزہ آیا، بڑی اچھی تبلیغ ہوئی، لیکن اگر یہ لطف لے کر واپس آجاؤ گے اور پھر دوبارہ اس شخص کی تلاش نہیں کرو گے اور دوبارہ اس سے نہیں ملو گے اور پھر سہ بارہ اس سے نہیں ملو گے اور پھر چوتھی دفعہ اس سے نہیں ملو گے اور پانچویں دفعہ نہیں ملو گے تو تم اپنے پھل سے محروم کر دیئے جاؤ گے کیونکہ وہ نیک اثر ابھی دائمی نہیں ہوا،

ابھی وہ پھل تمہاری جھولی میں نہیں آیا، ابھی تک وہ غیر کا ہے اور غیر کے قبضہ وتصرف میں ہے اس لئے جب تک وہ تمہارا نہیں ہو جاتا تمہیں مسلسل اس کی طرف توجہ کرنی پڑے گی اگر توجہ نہیں کرو گے تو تمہاری محنتیں ضائع ہوتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ ایسے بھی مبلغ آپ کے علم میں بھی ہوں گے میرے علم میں بھی ہیں کہ وہ چند مجالس کے نتیجہ میں سمجھتے ہیں کہ ہم نے کمال کر دیا، بہت تبلیغ ہوگئی، لوگ بڑے متاثر ہو کر واپس گئے ہیں۔ لیکن واپس پھر کہاں گئے؟ یہ پتہ نہیں کرتے۔ ہمیشہ کے لئے اندھیروں میں واپس چلے گئے ہیں یا دوبارہ واپس آنے کے لئے واپس گئے ہیں اس لئے تبلیغ کرنا یہ بھی حکمت کا تقاضا ہے۔

حکمت کے اور بھی بہت سے تقاضے ہیں لیکن وقت کی رعایت سے میں ایک آخری بات جو سب باتوں پر حاوی ہے وہ بیان کرتا ہوں۔ جب تک کسی کھیتی کی آبیاری نہ کی جائے اس وقت تک وہ پھل نہیں دے سکتی اور پانی دو طریق کے ہیں، ایک دنیا میں علم کا پانی جو آپ دیتے ہیں، یہ بھی بہت ضروری ہے لیکن اصل پھل اس فصل کو لگتا ہے جسے آسمان کا پانی میسر آئے اور وہ آپ کے آنسوؤں کا پانی ہے جو آسمان کے پانی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اگر محض علم کا پانی دے کر آپ کھیتی کو سینچیں گے تو ہرگز توقع نہ رکھیں کہ اسے بابرکت پھل لگے گا۔ لازماً دعائیں کرنی پڑیں گی لازماً خدا کے حضور گریہ وزاری کرنی ہوگی، اس سے مدد چاہنی ہوگی اور اس کے نتیجہ میں درحقیقت یہ مومن کے آنسو ہی ہوتے ہیں جو باران رحمت بنا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب فضل نازل فرمائے گا تو پھر آپ دیکھیں گے دلوں میں حیرت انگیز پاک تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہو جائیں گی۔

اب میں اور مختصر کرتا ہوا بات چلاتا ہوں۔ تیسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ موعظہ حسنہ ہے۔ حکمت کو پہلے رکھا پھر فرمایا موعظہ حسنہ سے کام لو۔ موعظہ حسنہ کا مطلب یہ ہے کہ اس دعوت الی اللہ میں کوئی بھی بحث نہیں، کوئی مجادلہ نہیں، ایک یک طرفہ بات ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ قرآن کریم بحث وتمحیص کو سب سے آخر پر نمبر دیتا ہے۔ سب سے پہلے حکمت کو رکھا۔ حکمت سے جب آپ فضا تیار کر لیتے ہیں، ماحول پیدا ہو جاتا ہے، تو پھر کیا کرنا ہے؟ فرمایا پھر موعظہ حسنہ سے کام لو۔ موعظہ حسنہ دلیل سے علاوہ ایک ایسی صاف اور سچی اور پاکیزہ نصیحت ہوتی ہے جو اپنے اندر ایک دلکشی رکھتی ہے اور اس کا کسی فرقہ ورانہ اختلاف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ براہ راست دل سے نکلتی

ہے اور دل پر اثر کر جاتی ہے۔ پس دلیلوں کا نمبر بعد میں آئے گا اس کا بھی قرآن کریم ذکر کرتا ہے۔ لیکن کہتا ہے ہمیشہ بات موعظہ حسنہ سے شروع کرو۔ تم لوگوں کو یہ بتایا کرو کہ بھائی مجھے تم سے ہمدردی ہے تم لوگ ضائع ہو رہے ہو، یہ معاشرہ تباہ ہو رہا ہے، کیوں تباہ ہو رہا ہے اس پر غور کرو۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے آتے ہیں اور بلا کر چلے جایا کرتے ہیں اور قومیں غافل رہ جایا کرتی ہیں۔ میں تمہیں پیغام دیتا ہوں ایسا آنے والا آ گیا ہے۔ تم اس کو قبول کرو۔ اب اس میں کوئی دلیل نہیں دی گئی یعنی کوئی ایسی دلیل نہیں دی گئی جس کے جواب میں کوئی الٹا یہ کہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ آپ کی بات مانے یا نہ مانے لیکن اس اصول کو بہر حال جانتا ہے کہ یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ خدا کی طرف سے آنے والے آتے ہیں ان کو بغیر پہچان کئے رد کر کے اور دھکے دے کر رخصت کیا جاتا ہے اور پھر وہ بھی دن آتے کہ حسرت سے لوگ ان وقتوں کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

ے امروز قومِ من نشناسد مقامِ من
روزے بگریہ یاد کند وقتِ خوشترم

کہ دیکھو آج کا دن ایسا دن ہے کہ میری قوم نے میرے مقام کو نہیں پہچانا لیکن آج میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ وقت آنے والا ہے کہ آہ وزاری کے ساتھ بلک بلک کر رویا کریں گے کہ کاش اس وقت ہم امام وقت کے ناصرین میں لکھے جاتے۔

پس یہ جو نصیحت ہے، یہ قانون قدرت سے تعلق رکھنے والی ایسی باتیں ہیں جو دراصل ہر شخص کے دل کی آواز ہوتی ہیں اور جب وہ آپ کے منہ سے نکلتی ہیں تو یہ رد نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ہر دل کی اپنی ایک کیفیت ہوتی ہے اس لئے قوم کے مزاج کو پہچان کر اس کے دکھتے ہوئے بدن پر ہاتھ رکھ کر اس کی نبض پر اپنی انگلیاں جما کر جو بات بھی آپ کرتے ہیں وہ موعظہ حسنہ ہے یعنی ایسی بات جو دل سے نکلے اور دل میں ڈوب جائے اس لئے قرآن کریم کہتا ہے کہ بحث میں جلدی نہ کیا کرو حکمت کے ساتھ موعظہ حسنہ شروع کرو تا کہ لوگ جان لیں کہ تم ان کے ہمدرد اور سچے ہو۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ تمہیں صرف اپنی ذات میں دلچسپی نہیں ان کی ذات میں بھی دلچسپی ہے۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ پھر بھی وہ لوگ تم سے لڑیں گے۔ ان

میں سے بہت سے ایسے ہوں گے کہ مارے غصّے کے جن کے منہ سے جھاگ جاری ہو جائے گی آنکھوں میں خون اتر آئے گا اور وہ بڑے سخت مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ فرمایا اس وقت بھی ہم تمہیں ہدایت دیتے ہیں کہ مقابلہ کرو اور پیٹھ نہ دکھاؤ۔ تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ معاشرہ میں کوئی غصّہ پیدا نہ ہو، کوئی نفرت پیدا نہ ہو، بہترین طرف بلایا، بہترین طریق سے کام لیا اور بہترین نصیحت کی۔ خدا فرماتا ہے کہ اس کے بعد پھر تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اب تم تیار ہو جاؤ، تمہارا پورا حق ہے کہ تم اپنی پوری قوت اور پوری شدت کے ساتھ ان لڑنے والوں کا مقابلہ کرو، لیکن مقابلہ جبر سے نہیں کرنا۔ فرمایا جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ اب بھی بدی کے ساتھ مقابلہ حسن کا ہی ہوگا۔ وہ بدی لے کر آئیں گے تم نے اس کی جگہ حسن پیش کرنا ہے۔ وہ تمہاری برائی چاہیں گے تم ان کی اچھائی چاہو گے، وہ کمزور دلیلیں دیں گے تم ان سے زیادہ قوی اور طاقتور اور دلکش دلیلیں نکالا کرنا اور ہر مقابلہ کی شکل میں تم حسن کے نمائندہ بن جانا اور وہ نفرت اور بدیوں کے نمائندہ بن جائیں گے۔

جب یہ دور شروع ہو جائے گا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے پھر یہ باتوں تک نہیں رہے گا۔ پھر ایسے لوگ بھی ہوں گے جو تمہیں بدنی سزا دیں گے جو تمہاری شدید مخالفت کریں گے۔ ہوسکتا ہے تمہارے گھر جلائیں، ہوسکتا ہے تمہیں اذیتیں دی جائیں یہاں تک کہ تمہیں اتنا دکھ دیا جائے جتنا کسی انسان کے بس میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسی صورت میں ہم تمہیں ایک نصیحت کرتے ہیں کہ پہلے سے اس بات کو آگے بڑھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ جب یہ لڑائی شروع ہو جائے گی یہ بات یاد رکھنا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون ہدایت پر ہے وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ صرف خدا جانتا ہے کہ ہدایت یافتہ کون ہے، اللہ ہی جانتا ہے بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ کہ کون اپنی راہ سے گمراہ ہو چکا ہے۔ اب بظاہر یہ بڑا تعجب انگیز فقرہ بیچ میں داخل ہو گیا۔ ایک طرف خدا کہتا ہے اپنے رب کی طرف بلاؤ حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بلاؤ اور جب لڑائی شروع ہوگئی تو اچانک گویا کہ یقین ہی اڑا دیا اپنے پیغام سے یعنی اس بات سے تو یوں لگتا ہے جیسے کہا جا رہا ہو کہ اب تم لڑ پڑو۔ لیکن یہ کوئی پتہ نہیں کہ تم سچے ہو کہ فلاں سچا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گمراہ کون ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہدایت پر کون ہے۔ اس آیت کا اور اس مضمون کا یہاں موقع کیا ہے پہلے اس کو حل کرتے چلے جائیں پھر اس کا بقیہ حصہ انشاء اللہ زیر نظر آئے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ کہ تو اپنے رب کی طرف بلا اور دنیا میں ہر شخص کو اپنے رب کی طرف بلانے کا حق ہے۔ یہ وہی آزادئ ضمیر اور آزادئ مذہب کا اعلان ہے جس کی تکرار کی جارہی ہے۔ فرمایا جب یہ مقابلہ شروع ہوگا تو اس وقت بھی ہر انسان یہ سمجھنے کا حق رکھتا ہے کہ میں ہدایت پر ہوں اور تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ تم چونکہ ہدایت پر نہیں ہو اس لئے تم ہمارے ساتھ بات نہ کرو، تم ہم سے مقابلہ چھوڑ دو اور ہتھیار ڈال دو۔

یہ وہی آزادئ ضمیر کا اعلان ہے جس سے بات کا آغاز ہوا تھا۔ وہی مضمون اب تکرار کے ساتھ دوہرایا جارہا ہے۔ فرمایا ہم جانتے ہیں کہ تم حق پر ہو لیکن تمہیں یہ حق نہیں دیتے کہ ایسے اور دعویٰ کرنے والوں کے دعویٰ کا حق چھین لو۔ اپنے رب کی طرف بلانے والے ہر شخص کو یہ حق ہم عطا کرتے ہیں کہ وہ یہ اعلان کرے کہ میں ہدایت پر ہوں اور تم گمراہی پر ہو۔ ہاں ہم تمہیں یہ بتاتے ہیں کہ اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے اور فیصلہ وہی کرے گا جو تمہارے حق میں ہوگا اس لئے اس میں تمہارا نقصان کوئی نہیں۔ تم ہر انسان کو اور ہر مدمقابل کو یہ آزادی دو کہ وہ تمہیں غلط قرار دے اور اپنے آپ کو سچا کہے اور یہ آزادی تمہارے خلاف نہیں جاتی کیونکہ اللہ تو بہر حال جانتا ہے کہ کون سچا ہے۔ اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مثلاً ہندو کہیں کہ ہم زیادہ ہدایت پر ہیں اور یہودی کہیں کہ ہم زیادہ ہدایت پر ہیں اور عیسائی کہیں کہ ہم زیادہ ہدایت پر ہیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم تمہیں یہ حق نہیں دیتے کیونکہ تم Minority (اقلیت) میں ہو اور یا یہ کہ ہم ہدایت پر ہیں اس لئے تم دعویٰ ہی نہیں کر سکتے بلکہ عام دعویٰ کا اعلان ہے فرماتا ہے هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ یہ صرف خدا کا حق ہے کیونکہ وہ جانتا ہے وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں ہدایت پر ہے اور فلاں ہدایت پر نہیں ہے لیکن کوئی انسان دوسرے کو اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔

بظاہر اس جملہ معترضہ کے بعد جس کی بڑی شدید ضرورت تھی اللہ تعالیٰ پھر اس مضمون کی طرف واپس لاتا ہے۔ فرماتا ہے وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ کہ اب لڑائی شروع ہوگئی ہے ہر چند کہ تم حسن سے کام لوگے، ہر چند کہ تم مغفرت سے کام لوگے، ہر چند کہ تم عفو سے کام لوگے لیکن دشمن ایسا نہیں کریگا وہ تمہیں بدنی سزائیں بھی دے گا، وہ تمہاری جان کے درپے بھی ہوگا، وہ تمہارے اموال کے درپے بھی ہوگا اور تمہاری عزتوں کے درپے بھی ہوگا۔ پس اگر

ایسی صورت پیدا ہو جائے تو فرماتا ہے کہ اگر تم یہ فیصلہ کرو کہ دشمن سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہے تو ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ جتنا تم پر ظلم کیا گیا ہے اس سے ایک انچ بھی زیادہ آگے نہیں بڑھنا یعنی جس حد تک دشمن تم پر ظلم کر رہا ہے اس کا جواب دینے کا ہم تمہیں حق دیتے ہیں۔ یہ اعلان فرما دیا ہے لیکن اس طریق پر اعلان فرمایا کہ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ یعنی شرط یہ ہے کہ پہل دوسرے نے کی ہو، زیادتیاں اور سفاکیاں اور ظلم و ستم کا آغاز مد مقابل نے کیا ہو، پھر تمہیں ہم حق دیتے ہیں کہ اس کے بعد اپنے دفاع میں ویسا ہی کرو لیکن اس سے آگے نہیں بڑھنا۔ لیکن یہاں بات ختم نہیں کرتا بلکہ فرماتا ہے وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ کہ یاد رکھو اگر تم صبر سے کام لو تو اللہ تعالیٰ تمہیں بتاتا ہے کہ صبر کرنے والے زیادہ کامیاب ہوا کرتے ہیں اور صبر کرنے والوں کا اپنے لئے یہی اچھا ہوتا ہے کہ وہ بدلہ نہ لیا کریں۔ خصوصاً دینی مقابلوں میں اور ہر معاملہ میں صرف نظر سے کام لیتے چلے جائیں اور اپنی برداشت اور حوصلے کے پیمانے بڑھاتے چلے جائیں لیکن عجیب خدا ہے اور ایسا انصاف ہے خدا کا کہ اپنے بندوں کو حق بہر حال دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ اگر تم پر ظلم ہوا ہے اور تم اس حد تک مقابلہ کرو جس حد تک ظلم ہوا تو تم پر کوئی حرف نہیں۔ خدا یہ نہیں کہے گا کہ میں تمہیں سزا دیتا ہوں تم نے ایسا کام کیوں کیا۔ ہاں اللہ تعالیٰ بطور نصیحت فرماتا ہے کہ اگر اپنا حق چھوڑ دو، صبر سے کام لو تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔

اب دیکھ لیجئے جو خطاب اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ میں واحد سے شروع ہوا تھا اس نے اجتماعیت اختیار کر لی اسی لئے میں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ تبلیغ کا یہ کام صرف محمد مصطفی ﷺ تک محدود نہیں بلکہ آپؐ کے ماننے والوں پر بھی فرض ہے ورنہ مخاطب تو آنحضورؐ کو کیا گیا تھا اچانک یہ سارے مسلمان بیچ میں کہاں سے شامل ہو گئے۔ واحد کا صیغہ جمع میں تبدیل ہو گیا اور سب کو اجازت دی جا رہی ہے کہ چاہو تو تم بدلہ لو لیکن ہم تمہیں مغفرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اب پھر یہ کلام واپس لوٹے گا اور واحد کی بات شروع کر دے گا اور اس طرز کلام میں عجیب حسن پیدا ہو جائے گا کہ کبھی روئے سخن واحد سے جمع میں بدل جاتا ہے اور کبھی جمع سے واحد کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کو بدلہ لینے کی اجازت دی کیونکہ ہر قسم کے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ برداشت نہیں کر سکتے، بعض برداشت کر سکتے ہیں، بعض کو عادت ہے، بعض کو عادت نہیں ہے، اس لیے انسانی فطرت کو مدنظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ جتنا ظلم ہوا ہے اتنا بدلہ لے لو

لیکن اس کا نمونہ وہ پیش کیا جس نے بدلہ نہیں لینا تھا۔ چنانچہ فرمایا وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہ اے محمد! (ﷺ) تجھے ہم یہ نہیں کہتے کہ اگر تو چاہے تو بدلہ لے لے اور چاہے تو صبر کرے۔ تیرے لئے یہ ارشاد ہے وَاصۡبِرۡ تو نے صبر ہی کرنا ہے اور اس بات کو واضح کرنے کے لئے کہ یہ نیا حکم نہیں ہے بلکہ رسول کریم ﷺ کی فطرت کا ایک فیصلہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توثیق کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ہم جانتے ہیں کہ تو صبر کر رہا ہے یعنی یہ نہیں بتایا کہ اے محمد! (ﷺ) تو بے صبری دکھا رہا ہے اس لئے ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ بے صبری نہیں کرنی اور صبر کرنا ہے بلکہ یہ فرماتا ہے کہ اے محمد! (ﷺ) تو صبر ہی کرتا چلا جا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تو پہلے ہی اللہ کی خاطر صبر کر رہا ہے۔ پس اس رستہ سے ہٹنا نہیں کیونکہ یہی بہترین رستہ ہے اور مسلمانوں کے لئے گویا دو رستے الگ الگ کر کے دکھا دیئے۔ ان کیلئے دونوں رستے کھلے ہیں یعنی صبر کا رستہ بھی اور انصاف کا بھی اور بدلہ لینے کا بھی لیکن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ایک رستہ پر چلا دیا یعنی صبر کے رستہ پر۔ اور دراصل صبر کا اعلیٰ ظرف آپؐ ہی رکھتے تھے۔

اب بتائیے کہ کون ہے جو اس رستہ کو چھوڑ کر اپنے لئے دوسرا رستہ اختیار کرتا ہے۔ انصاف کے تقاضے بھی پورے کر دیئے اور ایک عام اعلان کر دیا کہ اب دو شاخیں چل رہی ہیں، تم چاہو تو انتقام کی شاخ کو انصاف کے مطابق اختیار کر لو کوئی حرج نہیں ہے اور چاہو تو صبر والے طریق کو اختیار کر لو اور یہ رستہ پکڑ لو لیکن ہم تمہیں یہ بتا دیتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ صبر والے رستے پر ہی چلیں گے، انتقام لینے والے رستے پر نہیں چلیں گے اس لئے اب چاہو تو یہ قبول کر لو اور چاہو تو وہ قبول کر لو۔

اللہ تعالیٰ کا کتنا پیارا انداز ہے مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرنے کا اس سے زیادہ حسین انداز اختیار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس رستہ پر چلا دیتا ہے اور پھر آنحضرت ﷺ کے صبر کا تجزیہ فرماتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کس قسم کا صبر ہے جو تبلیغ میں مفید ثابت ہوگا۔ فرمایا وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ اب دیکھئے صبر دو قسم کے ہوا کرتے ہیں ایک غصے کا صبر اور ایک غم کا صبر۔ یہ دو ہی صبر ہیں جن سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے۔ ایک آدمی کو کسی دوسرے کی حرکت پر شدید غصہ آ رہا ہے اور وہ صبر کر رہا ہے۔ ایک صبر یہ ہوتا ہے کہ آدمی شدید غم محسوس کر رہا ہے اور پھر بھی صبر کر رہا ہے۔ صبر کے ساتھ یہاں بھی دو رستے بن گئے۔ جانتے ہو کس صبر کی طرف ہم تمہیں بلا رہے ہیں۔ یہاں یہ صبر کی وہ راہ ہے جو حضرت محمد

مصطفی ﷺ نے اختیار فرمائی ہے۔ وہ غصہ والا صبر نہیں وہ غم والا صبر ہے۔ غصہ تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ ان کی مثالیں ایسی ہی ہیں جیسے صبر کرنے والی ایک سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بچوں کی بے ہودہ حرکتوں پر صبر کر رہی ہو۔ اس کو طبعاً اور فطرةً بڑا غصہ آ رہا ہوتا ہے لیکن وہ چونکہ مہذب ہوتی ہے، اپنے اوپر کنٹرول رکھتی ہے اس لئے وہ صبر کر جاتی ہے۔ اور ایک سگی ماں ہے جو اپنے بچوں کی حرکتوں پر صبر کرتی ہے لیکن وہ غم کا صبر ہوتا ہے وہ اپنے غم میں گھلتی چلی جاتی ہے، وہ خود بھی دعائیں کرتی ہے اور دوسروں کو بھی دعاؤں کے لئے کہتی ہے۔ مجھے اس صبر سے بھی آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ مائیں آتی ہیں آج بھی کل بھی اور پرسوں بھی، یہاں بھی جو ملاقاتیں ہوتی ہیں ان میں بھی ہر روز کئی خواتین اپنے بچوں کی بعض بے ہودہ حرکتوں کا ذکر کرتے ہوئے دعا کے لئے کہتی رہتی ہیں جب بھی وہ اس قسم کی دعا کے لئے کہتی ہیں اس میں غصہ کوئی نہیں ہوتا وہ غم میں گھل رہی ہوتی ہیں، وہ رو رہی ہوتی ہیں، دعا کے لئے کہتے کہتے ان کی آواز بھرا جاتی ہے کہ بچہ ضائع ہو رہا ہے اس کے لئے دعا کریں۔

پس تم نے اس کی پیروی کرنی ہے جس کے صبر میں غصہ کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ وہ تو سگی ماں والا صبر کرنے والا انسان ہے بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر صبر کرنے والا ہے۔ وہ تو ان لوگوں کے غم میں اپنی جان ہلکان کر رہا ہوتا ہے جو اس کی بات کو نہ مان کر اپنا نقصان کر رہے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ اور یہ کہہ کر اس بے انتہا جذبۂ غم کا اظہار فرما دیا جو آنحضور ﷺ کے قلب صافی میں موجزن تھا۔ ایک کہنے والے نے بہت خوب کہا ہے:

ے کیوں، کیا ہوا، یہ آہ شرربار کس لئے
یہ تو نہیں کہا تھا کہ تو بے قرار ہو

کہ یہ کیسا غم، میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ تو غمگین ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ کلام نازل ہو رہا ہے تو آنحضرت ﷺ کا دل ان لوگوں کے غم سے بھر گیا ہے جو ان ساری باتوں کے باوجود نہیں مان رہے ہوں گے اور جس کے نتیجہ میں آپؐ نے صبر کرنا ہے اور پہلے بھی صبر کر رہے تھے۔ اچانک اللہ تعالیٰ اس مضمون کو چھوڑ کر کہتا ہے۔ اے محمدؐ! غم نہ کر، تو تو بہت ہی مقدس وجود ہے، تیرا مقام بہت بلند ہے، ان گھٹیا لوگوں کی خاطر تو اپنے نفس کو ہلاک کر دے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک جاری سلسلہ

ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بس میں نہیں ہے۔ یہ صرف پیار کا اظہار ہے ورنہ خدا اس غم سے نہ روکنا چاہتا ہے نہ محمد مصطفیٰ ﷺ نے رکنا تھا۔ اس نے خود آپ کو پیدا ہی اس طرح کیا تھا اس لئے لَا تَحْزَنْ میں پیار اور محبت کا یہ اظہار ہے کہ تو نہ غم کر تجھے کیا ہو گیا ہے، لیکن اللہ کو پتہ ہے کہ اس نے غم میں گھلتے ہی چلے جانا ہے اور اسی کے غم نے ان کی اصلاح کرنی ہے۔ پس مبلغ کو یہ بھی بتا دیا کہ صبر کرنا ہے تو وہ صبر کرنا ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کیا تھا۔ یہ کیسا پاک رسولؐ ہے کہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آپ کو دکھ دے رہے ہیں، تکلیف دے رہے ہیں دکھ تو محسوس کرتا ہے لیکن غصہ محسوس نہیں کرتا۔ اور دیکھئے یہ ہے بھی کتنی معقول بات۔ کیونکہ جس کو غصہ آتا ہے وہ اکثر صبر کا دامن چھوڑ ہی دیا کرتا ہے۔ وہ پھر بدلہ لینے والا رستہ اختیار کر لیا کرتا ہے۔ فرمایا یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ صبر کا رستہ اس لئے اختیار کیا کہ آپؐ کی فطرت میں اتنی زیادہ ہمدردی ہے کہ آپؐ اپنے دشمنوں کے لئے غم تو محسوس کرتے ہیں غصہ محسوس نہیں کرتے۔ صبر کے سوا اس کا کوئی چارہ کار نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ کہ بظاہر یہ طریق تو بڑا ہی مشکل طریق ہے اور یوں لگتا ہے کہ گویا اس سے کامیابی نہیں ہوگی۔ دشمن طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کر رہا ہے، طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔ دن رات منصوبے بنا رہا ہے کہ کس طرح Movement (تحریک) چلائی جائے، کس طرح اس جماعت کو تباہ کیا جائے اور اس پر بھی کہا جاتا ہے صبر کرو، صبر کرو، اور صبر بھی غصہ والا نہیں بلکہ غم والا صبر کرو۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد! (ﷺ) وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ہم جانتے ہیں کہ تیرا صبر صرف اللہ کی خاطر ہے اپنے رب کی خاطر ہے اس لئے وہ اب تجھے کس طرح چھوڑ دے گا جس کی خاطر تو صبر کر رہا ہے۔ فرماتا ہے وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ تو اپنا سینہ کھول لے اور اس کو کشادہ کر، ان لوگوں کے برے مکروں اور تدبیروں سے تجھے ہم کوئی بھی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔ تو ہماری خاطر صبر کرنے والا ہے ہم تیرے محافظ بن جائیں گے اور ہر آن تیری حفاظت کریں گے اور تیرے سلسلہ کی اور تیرے پیغام کی حفاظت کریں گے اور لازماً تمہیں کامیاب کریں گے۔ چونکہ تیرا صبر صرف میری خاطر تھا اب میں ذمہ دار ہو گیا ہوں۔ پھر فرماتا ہے إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ ﴿۱۲۹﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور محسن ہوتے ہیں۔

یہ جو آخری آیت ہے اس میں بھی ایک بہت ہی وسیع مضمون بیان ہوا ہے لیکن اسوقت اس کے بیان کرنے کا موقع نہیں اس لئے میں اس کو چھوڑتا ہوں پھر کسی وقت انشاء اللہ بیان کروں گا۔ یہ بھی اسی کے تسلسل میں ہے۔

اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ان تین آیات میں جو تلقین فرمائی ہے ان میں جیسا کہ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا لامتناہی مضامین کی کھڑکیاں ہیں اور لامتناہی طریقہ ہائے تبلیغ بیان فرما دیئے گئے ہیں۔ اگر آپ اس مضمون کو پیشِ نظر رکھیں تو آپ میں سے ہر آدمی ایک بہترین داعی الی اللہ بن سکتا ہے اور مقابلہ پر جو دلیلیں دی جاتی ہیں ان کا توڑ بھی آپ کو دے دیا گیا ہے اس لئے بہترین تبلیغی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس رب کی طرف لوگوں کو بلائیں جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب ہے۔

پس میں تمام احباب جماعت کو توجہ دلاتا ہوں کہ تمام دنیا کے انسان کو خدائے حي و قیوم کی طرف بلائیں۔ مشرق کو بھی بلائیں اور مغرب کو بھی بلائیں، کالے کو بھی بلائیں اور گورے کو بھی بلائیں، عیسائی کو بھی بلائیں اور ہندو کو بھی، بھٹکے ہوئے لوگوں کو بھی بلائیں اور دہریوں کو بھی، مشرقی بلاک کو بھی بلانا آج آپ کے سپرد کیا گیا اور مغربی بلاک کو بلانا بھی آج آپ کے ذمہ لگایا گیا ہے، یہ آپ ہی ہیں جنہوں نے دنیا کو موت کے بدلہ زندگی بخشنی ہے۔ اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو مرنے والے مر جائیں گے اور اندھیروں میں بھٹکنے والے ہمیشہ بھٹکتے رہیں گے اس لئے **اے محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلامو! اور اے دین مصطفیٰ ﷺ کے متوالو! اب اس خیال کو چھوڑ دو کہ تم کیا کرتے ہو اور تمہارے ذمہ کیا کام لگائے گئے ہیں تم میں سے ہر ایک مبلغ ہے اور ہر ایک خدا کے حضور اس بات کا جواب دہ ہوگا۔ تمہارا کوئی بھی پیشہ ہو، کوئی بھی تمہارا کام ہو، دنیا کے کسی خطہ میں تم بس رہے ہو، کسی قوم سے تمہارا تعلق ہو تمہارا اولین فرض یہ ہے کہ دنیا کو محمد مصطفیٰ ؐ کے رب کی طرف بلاؤ اور ان کے اندھیروں کو نور میں بدل دو اور ان کی موت کو زندگی بخش دو۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔**

خطبہ ثانیہ کے دوران حضور نے فرمایا:

نمازیں جمع ہوں گی۔ جمعہ کی نماز کے معاً بعد میں عصر کی نماز بھی ساتھ پڑھا دوں گا کیونکہ بہت سے دوست باہر سے آئے ہوئے ہیں اور انہوں نے واپس جانا ہے۔

ایک بات جو میں پہلے بھی مختلف جگہوں پر دوستوں کو سمجھا تا چلا آیا ہوں یہاں بھی سمجھا دوں ۔ دیہاتوں میں عموماً اس بارہ میں غفلت ہو جاتی ہے ۔ امام جب تک پوری طرح سلام پھیر کر نماز سے فارغ نہیں ہوتا اس وقت تک مقتدی اس کی اقتدا سے آزاد نہیں ہوتے ۔ نماز میں السلام علیکم سنتے ہی بعض لوگ فوراً دڑ دڑ کرتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ یہ ایک بدنظمی کا طریق ہے اور اسلامی نظم وضبط کی روایات کے بھی خلاف ہے ۔ جب امام آخر میں السلام علیکم کہتا ہے تو پھر دوبارہ بائیں طرف منہ پھیر کر السلام علیکم کہہ کر فارغ ہوتا ہے اس وقت اس کو بھی نماز سے اٹھنے کی اجازت ہے اور مقتدیوں کو بھی اٹھنے کی اجازت ہے اس لئے جنہوں نے بقیہ نماز پڑھنی ہو ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پوری طرح صبر کے ساتھ بیٹھے رہیں ۔ اور اس سے ایک اور بھی فائدہ ہوتا ہے کہ جس صبر کی تلقین کی جارہی ہے اس صبر کی عادت بھی پڑتی ہے ۔ دیکھا گیا ہے جو لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بے صبری کریں وہ بڑی باتوں میں بھی بے صبری کرتے ہیں ۔ اب امام سے پہلے اٹھنے سے کتنا وقت بچ جاتا ہے ۔ صرف سیکنڈز میں بچتا ہے کیونکہ دوسرا السلام علیکم اگر آپ آہستہ بھی کہیں تو تیس پینتیس سیکنڈز میں کہا جائے گا ۔ یہ تیس پینتیس سیکنڈز بچانے کے لئے جو لوگ افراتفری میں اٹھتے ہیں وہ دراصل اپنی فطرتی بے صبری کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں ۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی نمازیں بھی اکثر بے صبری میں پڑھی جاتی ہیں ۔

پس نماز کا نظم وضبط بہت گہرے سبق رکھتا ہے اس لئے آپ نماز میں صبر کا نمونہ دکھایا کریں اور امام کی متابعت میں بھی صبر کا نمونہ دکھایا کریں ۔ اس وقت تو کوئی موقع پیش نہیں آئے گا کیونکہ میں عصر کی نماز پوری پڑھوں گا ویسے میں مسافر تو ہوں لیکن میرا یہاں گھر ہے اور جہاں گھر ہو وہاں اگر آدمی چند گھنٹے کے لئے بھی آئے تو مسافر نہیں رہتا اس لئے اس دفعہ تو انشاء اللہ سب اکٹھے ہی سلام پھیریں گے لیکن چونکہ موقع تھا اس لئے میں نے آپ لوگوں کو بتا دیا ہے ۔ آئندہ جب بھی کوئی ایسا موقع پیدا ہوا کرے یا آپ نماز میں بعد میں آکر شامل ہوں اور ایک آدھ رکعت رہ گئی ہو تو آپ جلدی نہ اٹھا کریں ۔ امام فارغ ہو جائے پھر آپ کھڑے ہوا کریں ۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۲۳ رمئی ۱۹۸۳ء)